سرِّ ابراہیمؑ واسمٰعیلؑ یا معنی ذبح عظیم

آیۃ اللہ العظمیٰ سید العلماء سید علی نقی نقوی طاب ثراہ

بِسمِ اللہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیم

اَلحَمدُ لِلّٰہِ رَبِّ العَالَمِین وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلامُ علیٰ سَیِّدِ الاَنبِیَآئِ وَالمُرسَلِین اَبِی القَاسِمِ محمّد خاتم النّبییّن وَآلِہِ الطَّیِّبِینَ الطَّاھِرِینَ اَمَّابَعدُ فَقَد قَالَ اللہُ سُبحَانَہٗ فِی کِتَابِہِ المُبِینِ فَلَمَّا بَلَغَ مَعَہُ السَّعْیَ قَالَ یَا بُنَیَّ اِنِّی اَرٰی فِی المَنَامِ اَنِّی اَذْبَحُکَ فَانْظُرْ مَا ذَا تَرٰیْ قَالَ یَا اَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤمَرُ سَتَجِدُنِی اِنْ شَآءَ اللہُ مِنَ الصّٰبِرِینَ۔ فَلَمَّا اَسلَمَا وَتَلَّہٗ لِلْجَبِینِ۔ وَنَادَیْنٰہُ اَنْ یّٰاِبْرٰھِیمُ۔ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤیا۔ اِنَّا کَذٰلِکَ نَجْزِی المُحْسِنِینَ۔

(صافات ۱۰۲)

قرآن مجید نے بغیر نام لئے ہوئے حضرت ابراہیمؑ کے فرزند کی قربانی کا تذکرہ کیا ہے ان آیات کے ذیل میں جن کی تلاوت میں نے کی ہے۔ چونکہ نام مذکور نہیں ہے اس لئے کچھ علمائے اسلام میں بھی یہ چیز محل بحث ہوگئی ہے کہ یہ قربانی کا تذکرہ اسحٰق سے متعلق ہے یا اسمٰعیلؑ سے۔ مگر علمائے اسلام کے درمیان یہ اختلاف ہلکا ہے۔ کم علماء ہیں جو اس قربانی کو اسحٰقؑ سے متعلق قرار دیتے ہوں مگر حقیقت میں یہ مسلمانوں اور اہل کتاب کے درمیان کا اختلاف ہے کہ یہود اور نصاریٰ اس قربانی کو اسحٰقؑ کی قربانی قرار دیتے ہیں اور علمائے اسلام اسمٰعیلؑ کی۔

علمائے اسلام کے درمیان کیوں اختلاف ہوا؟ وہ اس بناء پر کہ اس تذکرہ کے شروع میں ان آیات سے پہلے بشارت کا ذکر ہے:-

فَبَشَّرْنَاہُ بِغُلَامٍ حَلِیمٍ۔

''ہم نے انھیں ایک متحمل و بردبار لڑکے کی بشارت دی۔''

چونکہ دوسرے مقامات پر یہ بشارت صراحۃً جناب اسحاقؑ سے متعلق ہے۔ فرشتے آئے اور انہوں نے جناب ابراہیمؑ سے کہا: اَنَا نُبَشِّرُکَ بِغُلَامٍ عَلِیمٍ۔ اسی سلسلہ میں ایک جگہ ہے:-

فَاَقْبَلَتِ امْرَاَتُہٗ فِی صَرَّۃٍ فَصَکَّتْ وَجْھَھَا وَ قَالَتْ عَجُوزٌ عَقِیمٌ۔ قَالُوا کَذٰلِکِ قَالَ رَبُّکِ اِنَّہٗ ھُوَ الحَکِیمُ العَلِیمُ۔ (ذاریات:۲۹)

جب جناب ابراہیمؑ کو ایک دانشمند لڑکے کی بشارت دی گئی۔ ان کی بیوی جناب سارہ نے جو ضعیف العمر بھی تھیں اور عقیمہ بھی سمجھی جا چکی تھیں اپنا منھ پیٹ لیا۔ اب چونکہ یہ بشارت جس کا کئی جگہ قرآن مجید میں تذکرہ ہے بلا شبہہ جناب اسحاقؑ سے متعلق ہے تو خیال ہوا کہ وہاں بھی بشارت کا ذکر جناب اسحاقؑ سے متعلق ہے اور اسی سلسلہ میں قربانی کا تذکرہ ہے تو وہ بھی جناب اسحاقؑ ہی سے متعلق ہوگا مگر یہ تصور درست نہیں ہے اور نہ یہ استدلال کوئی مضبوط بنیاد رکھتا ہے۔

آخر یہ سیاق کلام ہی کی بنا پر تو کہا جا رہا ہے کہ چونکہ پہلے بشارت کا ذکر ہے لہٰذا یہ قربانی بھی اسحاقؑ سے متعلق ہونا چاہیے لیکن اگر سیاق دیکھنا ہے تو پھر پورا سیاقِ کلام کیوں نہ دیکھئے۔ قرآن مجید میں یہاں قربانی کے تذکرہ کے بعد پھر یہ آیت آتی ہے:-

وَبَشَّرْنَاہُ بِاِسْحٰقَ نَبِیّاً مِّنَ الصَّالِحِینَ۔ اور ہم نے ابراہیمؑ کو اسحاقؑ (کے پیدا ہونے) کی (بھی) خوشخبری دی۔

اس سیاق سے صاف ظاہر ہے کہ پہلی بشارت اس فرزند کی تھی جس سے قربانی کا تعلق ہے اور پھر اس بشارت کا ذکر ہے جو جناب اسحاقؑ سے متعلق ہے جس کا ذکر قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر بھی کیا گیا ہے۔ یہ فیصلہ تو مسلمانوں کے درمیان کے اختلاف کا ہوا مگر علمائے اسلام اور اہل کتاب کے درمیان قرآن سے فیصلہ نہیں ہوسکتا۔ اس کے لئے بائبل کو دیکھئے۔

عہد نامۂ قدیم میں فرزند جناب ابراہیمؑ کی قربانی کا تذکرہ موجود ہے اصل بائبل کا تو پتہ نہیں ہے لیکن جس زبان میں یہ شائع ہوتی ہے۔ بائبل ہی کہلاتی ہے۔

بائبل میں قربانی سے پہلے حضرت ابراہیمؑ کی ایک مناجات مذکور ہے۔ اس کے تذکرہ سے پہلے ایک حقیقت کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں جو اہل کتاب کے درمیان بھی مسلّم ہے۔ وہ یہ ہے کہ اسمٰعیلؑ بڑے بھائی تھے۔ تیرہ (۱۳) برس اسحاق سے بڑے تھے۔ جب اسمٰعیلؑ تیرہ برس کے ہوئے تب اسحٰق کی ولادت ہوئی۔ اب بائبل میں دیکھئے کہ ابراہیمؑ نے قربانی پیش کرنے سے پہلے عرض کیا کہ پروردگارا! میں اپنا اکلوتا بیٹا تیری بارگاہ میں پیش کرتا ہوں۔ ظاہر ہے کہ چھوٹا بھائی اکلوتا کسی منزل میں نہیں ہوتا۔ بڑا بھائی اکلوتا رہتا ہے جب تک چھوٹا پیدا نہیں ہوتا۔ اس لئے یہ قربانی اسمٰعیلؑ سے متعلق ہوسکتی ہے۔ اسحاقؑ سے نہیں۔

یہ تو منقولی فیصلہ تھا مگر آج کل درایت پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو اگر یہ قربانی اسحاقؑ سے متعلق ہوتی تو یہود و نصاریٰ کے یہاں اس کی یادگار ہوتی مگر ان کے مذہبی رسوم میں اس کی کوئی یادگار نہیں ہے مگر ملت اسلامیہ کے اندر مراسم حج میں قربانی کی یادگاریں ہیں۔ ترویہ، عرفہ دونوں کے نام ظرف زمان کی یادگار اور عرفات و منیٰ ظرف مکان کی یادگار ہیں۔

''ترویہ'' کے معنی غور و فکر کے ہیں یعنی یہ وہ دن ہے کہ حضرت ابراہیمؑ خواب دیکھ چکے تھے اور اب طریق کار کے متعلق غور و فکر فرما رہے تھے۔ یوم ''عرفہ'' وہ دن جب طریق کار معین ہوا۔ ''عرفات'' وہ جگہ جہاں اس طریق کا رتعارف ہوا اور منیٰ ''وہ سرزمین جہاں یہ قربانی پیش کی گئی اور یہی وہ سرزمین ہے جہاں حاجیوں کو قربانیاں کرنا ہوتی ہیں۔'' یہ یادگاریں سرزمین مکہ پر قائم ہیں اور تاریخ اسلام میں موجود ہیں جو تاریخ عیسائیت میں نہیں ملتیں۔ مگر یہ اختلاف قربانی کی قدر و قیمت کا ثبوت ہے۔ دنیا رشک کرتی ہے اور اس کو اپنانا چاہتی ہے۔ اس کے بعد بڑی بدقسمتی ہوگی جمہور اہل اسلام کی کہ ایک عظیم ترین قربانی ان کے یہاں موجود ہے جو حسینؑ کی قربانی ہے اور پھر بعض حلقوں کی طرف سے اس کی یاد مٹانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

اب اس بحث کے طے ہونے کے بعد کہ یہ قربانی کس سے متعلق ہے، آیت کا ایک ایک جزء پیش کیا جاتا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے کہ ''ہم نے ابراہیمؑ کو بشارت دی ایک غلام حلیم کی، جب یہ فرزند دوڑ دھوپ کے قابل ہوا یعنی ایسا ہو گیا کہ باپ کی مدد کرسکتا ہے۔ اس کا کام سرگرمی سے انجام دے سکتا ہے تو کیا ہوا؟''

اب یہ ایجاز قرآن مجید کا ہے کہ سیاق و سباق کے قرینہ کی بنا پر بہت سی درمیان کی کڑیاں واقعہ کی چھوڑ دی جاتی ہیں۔ دیکھا خواب ایک دن، دو دن، تین دن مگر خواب دیکھنے کا ذکر چھوڑ دیا جاتا ہے جب ابراہیمؑ نے بیٹے سے ان خوابوں کا حال بیان کیا تو قرآن نے وہ قول نقل کر دیا۔ اسی سے معلوم ہوجائے گا کہ خواب کئی دن دیکھے تھے۔

ابراہیمؑ نے کہا ''یَا بُنَیَّ'' ''اے میرے بچّے'' اس تخاطب میں محبت کا اظہار ہے۔ محبت جو باپ کو اپنے بیٹے کے ساتھ ہے۔ اسے تعمیل حکم میں سدّ راہ نہ ہونا چاہئے لیکن حکم الٰہی اس فطری محبت کو دل سے نکالنے کا متقاضی نہیں ہے۔ اِنِّیْ اَرٰی فِی الْمَنَامِ ''میں خواب دیکھ رہا ہوں اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک دفعہ نہیں دیکھا ہے بلکہ کئی مرتبہ کیا۔

اَنِّیْ اَذْبَحُکَ فَانْظُرْ مَاذَا تَریٰ۔ کہ میں تمہیں ذبح کر رہا ہوں۔ سوچو! تمہاری کیا رائے ہے؟

میں جناب ابراہیمؑ کی بارگاہ میں عرض کرتا ہوں کہ حکم آپ کو ہے فرزند سے رائے لینے کی ضرورت کیا ہے؟ مگر حضور، اگر ابراہیمؑ فرزند سے رائے نہ لیتے تو قربانی کارنامۂ ابراہیمؑ ہوتی، کارنامۂ اسمٰعیلؑ نہ ہوتی لیکن جب فرزند سے خود مختارانہ طور پر رائے لے لی تو یہ کارنامہ دونوں کا ہو گیا۔

حقیقت سب کو معلوم ہے کہ خواب حکم الٰہی کی حیثیت رکھتا تھا مگر وحی بھیجنے کا جو عام طریقہ ہے اس کے برخلاف یہاں خواب دکھا دیا گیا۔ حکم اتنا شدید اور ذریعۂ حکم اتنا خفیف یعنی خواب۔ یہ بھی ایک انداز تھا امتحانِ قدرت کا۔ یعنی ذریعہ ایسا ہو جسے ناقص نفوس ''خواب'' کہہ کر ٹال سکتے ہوں۔ اب دنیا دیکھے کہ خلیل اس خواب کو کیا اہمیت دیتے ہیں؟ پھر خلیل بھی بیٹے سے تذکرہ کرتے ہوئے خواب ہی کہتے ہیں فرمانِ الٰہی نہیں کہتے۔ بات یہ ہے کہ اگر فرمانِ الٰہی کہہ دیں تو یہ ٹکڑا بے جوڑ ہو جائے کہ تمہاری کیا رائے ہے۔ جب فرمان ہو گیا تو رائے کا سوال ہی کیا؟ یہ اب بیٹے کا امتحان ہے کہ وہ باپ کے خواب کو کیا سمجھتا ہے؟ اگر وہ باپ کو صرف باپ سمجھتا ہے تو خواب کو فقط خواب سمجھے گا لیکن اگر وہ باپ کو رسول مانتا ہے تو خواب کو فرمانِ الٰہی سمجھے گا۔

میرے اس خیال کا کہ خالق کا خواب کی صورت سے وحی کرنا اور جناب ابراہیمؑ کا خواب ہی کہہ کر اسمٰعیل سے بیان کرنا امتحان کی غرض سے تھا قرآن مجید میں شاہد موجود ہے۔

امتحان میں ایک سوال کا پرچہ ہوتا ہے جسے معلّمین اور ارکان درس گاہ دیتے ہیں طالب علم کو اور ایک جواب کی کاپی ہوتی ہے جسے طالب علم داخل کرتا ہے۔

جناب ابراہیمؑ نے خواب دیکھا۔ یہ تو امتحان کے سوال کا پرچہ ہے۔ پھر ابراہیمؑ نے اسمٰعیلؑ سے مشورہ لیا، یہ بھی سوال کا پرچہ تھا۔ اب تک خواب اور بیان خواب رہا لیکن جہاں سے جواب شروع ہوا۔ بیٹے نے لفظ بدل دی۔ اسمٰعیلؑ نے کہا:-

یَا اَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ۔ اے بابا جو حکم ہو رہا ہے اس کی تعمیل کیجئے۔

چونکہ جناب ابراہیمؑ نے کہا تھا کہ میں خواب دیکھ رہا ہوں۔ یعنی کئی دفعہ دیکھ چکا ہوں تو اسمٰعیلؑ نے بھی یہی کہا کہ جو حکم ہو رہا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ جو پہلی دفعہ آپ نے خواب میں دیکھا وہ بھی حکم تھا اور جو دوسری دفعہ دیکھا وہ بھی حکم تھا اور اسی طرح جو تیسری بار دیکھا۔

پھر کہتے ہیں:-

سَتَجِدُنِیْ اِنْ شَآءَ اللّٰہُ مِنَ الصَّابِرِیْنَ۔ اللہ نے چاہا تو مجھے صبر کرنے والوں میں سے پائیے گا۔

بلا شبہ گفتگو کا ٹھہراؤ طمانینت قلب کا پتہ دے رہا ہے۔ گھبراہٹ کے جواب کا انداز اور ہوتا ہے مگر اسمٰعیلؑ کے جواب ہی سے ظاہر ہے کہ وہ اس درجۂ رفیعہ پر بھی اس امتحان میں کامیابی کے بعد اپنے منفرد صابر ہونے کا تصور نہیں رکھتے۔ جیسے کوئی جماعت صابرین پیش نظر ہے جس سے ملحق ہو جانا اپنی بڑی کامیابی سمجھتے ہیں۔

ابتدائے عمل کے منازل طے ہوئے۔ اب تعمیل کی منزل ہے اس کے لئے قرآن فرماتا ہے:-

فَلَمَّا اَسْلَمَا ''دونوں مسلم ہو کر آ گئے''۔ اس سے اسلام کی رفعت کا احساس ہونا چاہئے۔ یہ معیار بلندی اسلام ہے۔

وَتَلَّہٗ لِلْجَبِیْنِ۔ ''اور باپ نے بیٹے کو پیشانی کے بھل لٹایا۔''

نزاکت قلب و دماغ انسانی کو مدنظر رکھتے ہوئے صراحۃً کیفیات قربانی بیان نہیں کئے گئے۔ ذاکرین بیان کرتے ہیں کہ باپ نے آنکھوں پر پٹی باندھ لی اور یہ محبت پدری کی بناء پر اس لئے تھا کہ بچہ کی حالت اپنی آنکھ سے نہ دیکھیں۔ مجھے بھی اس کے تسلیم کرنے میں کوئی عذر نہیں ہے۔ اس لئے کہ اسلام فطری محبت کے تقاضوں کو دور نہیں کرتا۔ حکم کی تعمیل کرنا ہے۔ آنکھوں سے دیکھتے رہنے کا تو حکم نہیں ہے۔ ابراہیمؑ اس کیفیت کو اپنی آنکھ سے نہ دیکھیں تو کیا حرج ہے بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ نتیجۂ امتحان کے پیش نظر آنکھوں پر پٹی باندھنے سے کارنامہ زیادہ شاندار بن

گیا۔ یعنی باپ نے آنکھ بند کر کے بیٹے کے گلے پر چھری چلادی۔ اب کون ذبح ہوا؟ اس کی ذمہ داری جناب ابراہیمؑ پر نہیں ہے۔

عمل کی جتنی منزلیں تھیں انجام تک پہنچادیں۔ اب خالق فرماتا ہے:-

نَادَیۡنٰاہُ اَنۡ یَّااِبۡرَاھِیۡمُ قَدۡ صَدَّقۡتَ الرُّؤۡیَا۔

ہم نے آواز دی کہ اے ابراہیم تم نے خواب سچ کر دکھایا۔

اب یہ وہ منزل ہے جہاں اکثر ذاکرین ومقررین کے اندازِ تعبیر سے مجھے اتفاق نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ حکم برطرف کر دیا گیا یا منسوخ ہو گیا، مجھے اس سے اتفاق نہیں ہے۔ عقلاً بھی اور از روئے قرآن بھی۔

عقلی پہلو تو یہ ہے کہ امتحان اور حکم کا تعلق افعال اختیاری سے ہوتا ہے۔ اب اگر اختیار کی حد تک کوئی بات رہ جائے تو حکم بر طرف ہوا۔ جب منازلِ عمل تمام ہو چکے تو اب حکم منسوخ ہو کر کیا کرے گا؟ ذبح میں افعالِ اختیاری کیا ہوتے ہیں؟ بچّہ کو لٹانا، ہاتھ میں ایک دھاردار آلہ لینا اور اس کی گردن پر رکھنا، ہاتھ کو وہ جنبش دینا جس سے رگ گردن قطع ہوجائے۔ یہ منزلیں ہیں عمل کی۔ کون سی بات رہ گئی جو حکم برطرف ہو؟ کیا بچّہ کو لٹایا نہیں؟ کیا ہاتھ میں چھری نہیں لی؟ کیا ہاتھ کو وہ جنبش نہیں دی کہ رگ گردن کٹ جائے؟

پھر جب حضرت ابراہیمؑ تمام منازل عمل اپنے حدودِ اختیار میں طے کر چکے تو اب حکم منسوخ ہو کر کیا کرے گا۔؟

دوسری دلیل نیم عقلی، نیم قرآنی یعنی قرآن کے سہارے عقلی دلیل یہ ہے کہ یہاں حکم کوئی لفظی تو تھا نہیں جس کے مفہوم پر غور کیا جائے۔ حکم تو خواب سے مستفاد ہوا ہے۔ اب خواب کو دیکھئے کیا دیکھا تھا؟ یہ نہیں دیکھا تھا کہ ذبح کر چکا ہوں بلکہ دیکھا یہ ہے کہ ذبح کر رہا ہوں۔ تو جو دیکھا تھا اسے عمل میں لے آئے۔

تیسرا استدلال خالص قرآنی یہ ہے کہ عمل کے بعد آواز قدرت کیا آئی؟ کیا یہ کہ بس بس ہم نے حکم ہٹا لیا؟ نہیں بلکہ یہ کہ اے ابراہیمؑ تم نے خواب سچ کر دکھایا۔'' اس سے صاف ظاہر ہے کہ حکم کی پوری تعمیل ہوگئی کوئی کمی باقی نہیں رہی۔ ایسے شاندار انداز میں یہ قربانی معرض وجود میں آئی۔ جب کہ ابراہیمؑ نے قربانی پیش کرنے میں اور اسمٰعیلؑ نے قربان ہونے میں کوئی کمی نہ کی تو اب خالق نے جو ذبح ہونے نہیں دیا، فدیہ بھیج دیا تو اس سے ظاہر ہے کہ خالق ہی کے کچھ مقاصد ان کی اس حیات سے وابستہ تھے۔ اس لئے قربانی کے معرضِ عمل میں آنے کے بعد نتیجہ کو روک دیا۔ ممکن ہے وہ مقصدِ الٰہی یہ ہو کہ ابھی اسمٰعیلؑ کی اس نسل کو وجود میں آنا ہے جو قربانی کی مسلسل تاریخ مرتب کرنے والی تھی۔ اس لئے اس قربانی کو وقوع میں نہیں آنے دیا گیا لیکن اس سے ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ کے کردار میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ اسی لئے ذبح نہ ہونے کے باوجود لقب ''ذبیح اللہ'' ہو گیا۔

مسلمانوں میں اس قربانی کی یادگار بھی قائم ہے۔ عیدالاضحیٰ یعنی عید قربان کے موقع پر اس قربانی کی یاد تازہ کی جاتی ہے۔ اگر آپ حج میں ہیں تو قربانی واجب ہے اور اگر وہاں نہیں ہیں تو بھی تمام عالم اسلامی کی فقہ کا مسلّمہ ہے کہ قربانی سنت ہے۔ یہ یادگار ہے اس قربانی کی۔

یہی وہ منزل ہے جہاں میں تمام مسلمانوں کو غور کرنے کی دعوت دیتا ہوں۔ ایک گذشتہ دور کے نبی کی ملتوی شدہ قربانی یاد رکھنے کے قابل ہو اور اپنے رسوؐل کی وقوع میں آئی ہوئی قربانی یاد رکھنے کے قابل نہ ہو؟

وہ ۱۰؍ذی الحجہ کو، یہ ۱۰؍محرم کو۔ وہ عاشورائے ذی الحجہ تھا، یہ عاشورائے محرم ہے۔ وہ خلیل کی قربانی تھی، یہ حبیب کی قربانی ہے۔ اگر کوئی کہے کہ ۶۱ھ میں حبیب خداؐ کہاں تھے؟ تو میں وہاں کی بات یہاں الٹ کر کہوں گا۔ وہاں ابراہیمؑ نے اسمٰعیل سے ذکر کیوں کیا تھا؟ اسی لئے تو کہ اگر ذکر نہ کرتے تو قربانی کارنامۂ خلیل ہوتی مگر کارنامۂ اسمٰعیل نہ ہوتی۔ اسی طرح ۶۱ھ میں ہونے والی قربانی کا ذکر رسولؐ سے خالق نے ولادت حسینؑ سے پہلے ہی کر دیا کہ تمہارا نواسا شہید ہوگا۔ خدا نے اپنے حبیبؐ کو اطلاع دے دی۔ اگر رسولؐ سے قربانی حسینؑ کا ذکر نہ کیا گیا

ہوتا تو قربانی کربلا کارنامہ ٔ حسینؑ ہوتی، کارنامہ ٔ رسولؐ نہ ہوتی، مگر رسولؐ سے ذکر کرنے کا مطلب ہی یہ تھا کہ یہ قربانی کارنامہ ٔ رسولؐ ہوجائے۔ لہٰذا جس طرح قربانی اسمٰعیلؑ امتحان ابراہیمؑ تھی۔ اسی طرح قربانی حسینؑ امتحانِ محمد مصطفیؐ ہے۔ اب جتنے درجے کوئی محمدؐ کو ابراہیمؑ سے بلند سمجھتا ہو، اتنے ہی درجے قربانی کربلا کو بلند سمجھنے کا اس کو حق ہے۔ وہ ابراہیمؑ کی پیش کی ہوئی قربانی تھی اور یہ محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیش کی ہوئی قربانی۔ اسے یاد رکھتے ہیں تو اسے بھی یاد رکھئے۔

ہر مسلمان کو معلوم ہونا چاہئے کہ گذشتہ انبیاءؑ سے ہمارا تعلق صرف ایمان کا ہے، ان کی شریعت پر عمل کرنا ہمارا فریضہ نہیں ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کچھ سُنَنِ ابراہیمی کو اسلام میں جزء شریعت بنادیا گیا ہے۔ وہ چیزیں اس لئے مستحق عمل ہیں کہ شریعت اسلامی میں داخل ہیں ورنہ اگر سنت ابراہیمی تمام داخل شریعت ہوتی تو بیٹے کو قربانگاہ میں لانا عبادت ہوتا مگر یہ طریقہ چونکہ شریعت اسلام میں منسوخ ہوگیا، اس لئے ہمارے لئے اس پر عمل ناجائز ہوگیا۔ غرض تمام انبیائے سلف سے رشتہ ایمان کا ہے، عمل کا نہیں ہے مگر رسولؐ اسلام سے ہمارا رشتہ ایمان اور عمل دونوں کا ہے۔ تو گذشتہ رسولؐ کے کارنامہ کی یاد جب زندہ رکھی گئی تو ہمارے رسولؐ کے گھر کی قربانی جس سے ہمارا تعلق ایمان وعمل دونوں کے اعتبار سے ہے وہ کیونکر یاد رکھنے کے قابل نہ ہوگی؟

سوال کیا جاتا ہے کہ یاد تو رکھیے، مگر غم کیوں کیجئے؟ اتنا بڑا کارنامہ تھا تو اس پر ناز کرنا چاہئے اور اس پر خوش ہونا چاہئے یہ غم کی کیا بات ہے؟ مگر یاد رکھیے کہ اسمٰعیلؑ کی قربانی کی یاد میں عید منائی گئی اور یہ دن روز عید قرار پایا۔ کیوں؟ اسمٰعیلؑ تو بچ گئے تھے۔ اگر مسلمان اس پر غم مناتے کہ کیوں بچے تو اس کی مناسبت سے روز عاشورا خوشی معقول ہوتی مگر جب ایک نبی زادہ بچ گیا تو عید منائی گی تو پھر عاشورائے محرم کو ماتم کرنا چاہئے کہ رسول زادہ دنیا سے اٹھ گیا۔ ماتم کیجئے کہ رسولؐ کا گھر تاراج ہوگیا اور اٹھارہ جنازے گھر سے نکل گئے۔

بے شک شہادت ایک بڑا مرتبہ ٔ رفیعہ ہے مگر اس مرتبہ کا تعلق آخرت سے ہے اور احکام کا تعلق دنیا سے ہے۔ کسی پر تیر پڑتے ہوں اور کوئی ہنستا ہو، یہ دشمنی اسلام ہی نہیں، دشمنی فطرت بھی ہے۔

درجہ ٔ رفیعہ شہید ہونے والے کے ساتھ ہے۔ حضرت فاطمہ زہراؑ کیا باپ کے درجہ ٔ رفیعہ سے معاذ اللہ ناواقف تھیں مگر گریہ کیا۔ اصحاب میں کہرام برپا تھا۔ شاہ عبدالحق صاحب 'مدارج النبوۃ' لکھتے ہیں کہ بعض صحابہ جنگلوں میں نکل گئے۔ جس دن بلال آئے ہیں اور مدینہ میں خبر ہوئی ہے پردہ نشین عورتیں بھی روتی پیٹتی گھروں سے باہر نکل آئی تھیں۔ مورخین لکھتے ہیں کہ وفاتِ رسولؐ کے بعد سے اتنے رونے والوں کی صدائیں کبھی نہیں سنی گئیں جتنی بلال کے آنے پر سنی گئیں۔ کیا ان سب رونے والوں کو رسولؐ کے درجہ ٔ رفیعہ میں شک تھا۔ پھر اگر سیدہؑ کو رسولؐ پر رونے کا حق تھا تو سکینہؑ کو حسینؑ پر رونے کا بھی حق تھا اور جب صحابہ کو رسولؐ کے غم میں رونا روا تھا تو دوستان اہل بیت کا بھی حسینؑ پر رونا حق بجانب ہے۔ یہ رونا ان کے درجہ ٔ رفیعہ کے خلاف نہیں ہے۔ فطرت کا تقاضہ ہے رسولؐ خود حسینؑ کو روئے۔ جب پہلی دفعہ ولادت کے بعد جناب اسماء نے نواسے کو رسولؐ کی گود میں دیا رسولؐ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔

لوگ ہم سے کہتے ہیں کہ زندۂ جاوید کو کیوں روتے ہو؟ انہیں رسولؐ سے پوچھنا چاہئے کہ زندہ پر گریہ کیوں فرما رہے ہیں؟

کہا جاتا ہے کہ آخر اتنی مدت گذرنے کے بعد اب تک کیوں رویا جارہا ہے؟ میں کہتا ہوں کہ جنہیں حق تھا رونے کا انہیں بروقت رولینے دیا ہوتا تو شاید گریہ آج تک قائم نہ رہتا۔

حسینؑ پر رونے والوں کی کمی نہیں تھی۔ زینبؑ وام کلثومؑ ایسی بہنیں، ام لیلیٰ اور رباب ایسی بیویاں، سکینہ اور فاطمہ ایسی بیٹیاں اور زین العابدینؑ ایسا فرزند، مگر ارباب عزا! رونے نہیں دیا گیا۔ خیموں میں آگ لگادی گئی تھی۔ کہاں روتے؟ دوسرے دن ۱۱؍محرم کو قید ہوگئے۔ اب راہ کوفہ وشام میں یہ حال

ہے کہ امام فرماتے ہیں کہ جب ہم میں سے کسی کی آنکھ سے آنسو نکلتا تھا تو سروں کو نوک نیزہ سے اذیت پہنچائی جاتی تھی۔ شہزادیاں رونے نہیں پائیں۔ قدرت کا انتظام دیکھئے کہ کائنات کو نائب زینب بنادیا۔ جو زینبؑ کرتیں وہ دنیا کررہی ہے۔ وہ قربانیٔ اسمٰعیلؑ تھی، یہ قربانی حسینؑ۔ یوں کہوں کہ وہ قربانی خلیلؑ اور یہ قربانی حبیبؐ۔ واقعاتی طور پر دونوں میں فرق دیکھئے قربانی خلیلؑ میں باپ کا کردار الگ تھا، بیٹے کا کردار الگ۔ ان کا کام تھا قربانی کرنا اور ان کا کام تھا قربان ہونا، مگر کربلا میں حسینؑ بوقت واحد ابراہیمؑ بھی تھے اور اسمٰعیلؑ بھی۔ ابراہیمؑ اس لئے کہ انھوں نے اٹھارہ اسماعیل راہ خدا میں پیش کردیئے اور اسمٰعیل اس لئے کہ خود راہِ خدا میں قربان ہوگئے۔

اسمٰعیلؑ بھوکے اور پیاسے تو نہ تھے مگر کربلا کے اسمٰعیل تین دن کے بھوکے پیاسے تھے۔ اسمٰعیلؑ کم عمر تھے۔ گیارہ بارہ سال کی عمر مگر حسینؑ نے میدانِ قربانی میں دونوں مثالیں پیش کردیں۔ اٹھارہ برس کا کڑیل جوان بھی راہ خدا میں قربان کیا اور ۶ رمہینے کا کمسن بچہ بھی۔

وہاں بارہ ۱۲ برس کا بچہ اس کی قربانی کی اہمیت قرآن نے ان لفظوں میں بیان کی ہے کہ ''فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْیَ'' وہ جب باپ کی مدد کے قابل اور چلنے پھرنے کے لائق ہوا۔'' اور یہاں حضرت امامِ حسینؑ نے جو قربانی پیش کی وہ علی اکبر کی جنہیں کہنا چاہیے برابر کا بیٹا جو دست و بازو کی قوت تھا۔ اٹھارہ (۱۸) برس کی عمر مشہور ہے اور اکثر علماء نے ۲۵ ربرس کی عمر بتائی ہے۔ بھرپور جوانی یعنی چچا بھتیجے میں بس تھوڑا سا فرق۔ عبّاسؑ ۳۲ رسال کے اور علی اکبرؑ ۲۵ سال کے۔ دونوں برابر کے جوان۔

یوں تاریخی حیثیت سے ایک مستند روایت تو یہ ہے کہ قربانی اہلبیتؑ کا افتتاح ہی مولا نے اپنے بیٹے سے کیا تھا مگر روایت مشہور یہ ہے کہ جب کوئی نہ رہا۔ عباسؑ بھی کمر توڑ گئے تو علی اکبرؑ نے اجازت جہاد طلب کی۔

اسمٰعیلؑ باپ کو کتنے ہی عزیز کیوں نہ ہوں، کسی بزرگ کی تصویر نہیں تھے لیکن حسینؑ کا یہ فرزند ہو بہو رسولؐ کی تصویر ہے۔ چنانچہ ان کے ساتھ امام حسینؑ نے یہ خصوصیت برتی کہ کسی کی رخصت کے وقت اللہ کو گواہ نہیں کیا مگر جب علی اکبرؑ کو رخصت کیا تو اللہ کو گواہ بنایا۔

اَللّٰھُمَ اَشْھَدْ عَلیٰ ھٰؤُلاۤءِ الْقَوْمِ فَقَدْ بَرَزَ اِلَیْھِمْ غُلَامٌ اَشْبَهُ النَّاسِ خَلْقاً وخُلْقاً وَمَنْطِقاً بِرَسُوْلِکَ وَکُنَّا اِذَا اشْتَقْنَا اِلیٰ نَبِیِّکَ نَظَرْنَا اِلیٰ وَجْھِہٖ۔

پروردگارا! گواہ رہنا اس قوم کے ظلم پر کہ اب وہ جارہا ہے، کون؟ امامؑ اس موقع پر کیا کیا کہہ سکتے تھے؟ یہ کہہ سکتے تھے کہ میرا کڑیل جوان جارہا ہے۔ ضعیفی کا سہارا جارہا ہے۔ گھر کی رونق جارہی ہے۔ ماں کے دل کا سہارا اور پھوپھی کا اٹھارہ (۱۸) برس کا ریاض جارہا ہے مگر یہ کچھ نہیں کہا۔ فرمایا وہ جارہا ہے جو صورت اور سیرت میں تیرے رسولؐ سے مشابہ ہے۔ پروردگارا! جب ہم مشتاق زیارت تیرے رسولؐ کے ہوتے تھے تو اس فرزند کو دیکھ لیتے تھے''۔ اس طرح حسینؑ نے یہ اصول بھی بتادیا کہ کسی زیارت کے مشتاق ہوں تو شبیہ کو دیکھ لیں۔ اس طرح اجازت دی علی اکبرؑ کو۔

اب دوسری خصوصیت ہے علی اکبرؑ کی یہ کہ امامؑ نے جس کو رخصت کیا بس رخصت کردیا۔ عباسؑ، عونؑ، محمدؑ اور قاسمؑ سب کو رخصت کیا تو بس رخصت کردیا مگر جب علی اکبرؑ کو رخصت کیا تو مولا اپنی جگہ پر نہیں ٹھہر سکے۔ علی اکبرؑ کے گھوڑے کے پیچھے دور تک چلے گئے۔ فرماتے ہیں بیٹا مڑمڑ کر باپ کو دیکھتے رہو۔ گذشتہ مناجات کی روشنی میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ بیٹے کی محبت تھی یا شبیہ رسولؐ کا احترام تھا۔؟ کہاں تک جاتے حسینؑ۔! آخر اپنی جگہ پر واپس آئے۔ علی اکبرؑ پہنچے میدان میں اور جہاد کیا۔

بس اب آخر میں علی اکبرؑ کے کردار کی ایک خصوصیت ملاحظہ ہو۔

اربابِ عزاء! جس نے حسینؑ کو پکارا، یہ کہا کہ مولا خبر لیجئے۔ اصحاب میں سے ہر ایک نے برابر وقت شہادت یہی آواز دی کہ یامولاہ ادرکنی بھتیجوں نے پکارا یا عمّاہ ادرکنی،

عباسؑ کے علاوہ تمام بھائیوں نے پکارایا اَخاہ ادر کنی ''بھائی مدد کیجئے۔'' ہر ایک نے اسی طرح پکارا اور مولا مدد کو گئے۔ مگر علی اکبرؑ جب زمین پر آئے تو علی اکبرؑ نے لفظیں بدل دیں۔ یہ نہیں کہتے کہ یا ابتاہ ادر کنی ''بابا! مدد کو آیئے''۔ ایک تو ننگ شجاعت محسوس کیا ہوگا شہزادہ نے کہ جوان بیٹا بوڑھے باپ کو مدد کے لئے بلائے۔ دوسرے یہ خیال کیا ہوگا کہ جب دوسرے شہداء بابا کو بلاتے تھے تو میں ساتھ جاتا تھا۔ اب میں پکاروں تو حسینؑ کے ساتھ آنے والا کون رہ گیا ہے؟ لہٰذا پکار کر کہتے ہیں! یا ابتاہ علیک منّی السّلام مطلب یہ ہے کہ اے بابا! آنے کی زحمت نہ کیجئے۔ بس میرا اسلام آخر قبول فرمالیجئے۔

یہ شمس آباد ضلع فرخ آباد میں ۷ رمحرم ۱۳۸۷ھ/ ۱۹۶۷ء کی صوت بند (ریکارڈ کی ہوئی) مجلس جناب ظہور حسین رضوی نے تحریری شکل دی اور 'امامیہ مشن' لکھنؤ نے اپنے سلسلۂ اشاعت نمبر ۵۶۷ کے طور پر محرم ۱۳۸۹ھ/ ۱۹۶۹ء میں شائع کیا تھا۔

بقیہ ۔۔۔۔ حسین تمدنِ اسلام کا اساس ہیں

ایران جو چار سو سال دور حکومت کو ساسانیوں کی پیش کر کے دوسرے ممالک کو تہذیب وتمدن کی دعوت دے رہا تھا، عربوں کے ناگہانی حملہ سے تباہ و برباد ہو گیا۔ اس کی صنعت وحرفت کا یک لخت خاتمہ ہو گیا تھا، اس کی قومیت، تجارت، تمدن کی کل شاخیں پامال ہو چکی تھیں، دسویں صدی تک گویا آدھا ایران عرب بن چکا تھا۔ لیکن حسینیت نے ان میں پورا کام کیا اور حسینی مشن (یعنی امام زادے اور سادات) نے اپنے خون سے زمین خشک ایران کی آب پاشی کی، جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ ایران میں دسویں صدی میں متحدہ قومیت کی تمام خصوصیت پیدا ہو گئیں۔ انہوں نے عربی چولا اپنی گردنوں سے اتار پھینکا بلکہ ممالک عرب پر بھی اپنا وقار قائم کر دیا اور زمین بابل جس پر حسینی خون بہا تھا، اور سادات بے دریغ تہہ تیغ ہوئے تھے، اسی بابل کو آج تک کے لئے اپنا اخلاقی، تمدنی، علمی، یا گلزار (باجگزار) بنالیا۔ آج عراق کے جنگلوں میں وحشی عربوں میں ایرانی تمدن نمایاں طور پر ظاہر ہے۔

حسینیت نے ایران کو فتح کر کے بابل کا فاتح بنا دیا۔ اور اسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ ہندوستانی دروازے کھول دیئے۔ اور باوجود سخت ترین مخالفتوں اور مزاحمتوں کے آج تمام ہندوستان حسینیت کو ایرانی لباس میں لئے حفاظت کر رہا ہے، اس لئے کہ ایران ہی حسینیت کا علمبردار بن کر ہندوستان میں داخل ہوا۔ اور حسینی تصدق میں اپنا تمدن، زبان، اخلاق، ہندوستان کی غیر اقوام کو سپرد کر کے مضبوط رشتۂ اتحاد قائم کر لیا۔ اور آج بھی حسینی جھنڈے کے نیچے مختلف اقوام کو جمع کرنے کی بہت کچھ قابلیت ایران میں موجود ہے بشرطیکہ وہ ہوش میں آئیں اور پچھلی تاریخ کو دہراتے ہوئے فکر وتدبر سے کام لیں۔ والسلام علی من اتبع الھدیٰ

(ماخوذ از ''حسینی پیغام'' بمبئی، ۲۲ رمئی